محمد حنیف ندوی

تاثرات

علم وادب کا سب سے اونچا تقاضہ انصاف ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے حریفوں کے معاملہ میں بخل سے کام لیتا ہے۔ اور ان کے خیالات وافکار یا خدمات کا صحیح اعتراف نہیں کرتا، تو وہ اور جو کچھ بھی ہو ادیب یا عالم ہرگز نہیں ہے۔ یہی سیدھی سی بات ہمنے پچھلے دنوں مدیر "معارف" کے گوش گزار کرنا چاہی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے اس حقیقت کا اظہار ان پر سخت گراں گذرا ہے۔ اور بے چارا بجائے اس کے کہ اس سے محظوظ ہوتا اور اس باب میں اپنے اجارہ دارانہ طرزِ عمل کی اصلاح کرتا اس احساس کہتری کا شکار ہو کر رہ گیا ہے کہ کہیں اس سے اپنا زعم فضیلت تو خطرہ میں نہیں پڑ جاتا۔ اور دوسروں کے محاسن کے اعتراف کے معنی کہیں اپنے کو ختم کر دینا تو نہیں ہیں۔ مدیر معارف اور انکے حلقہ کے بزرگوں کی اس غلط فہمی کو ہم دور کرنا چاہتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ کبھی کبھی دوسروں کی خدمات و مساعی کا فیاضانہ اعتراف کر لینے سے نہ صرف یہ کہ اپنا مقام ذرا بھی فروتر نہیں ہوتا، بلکہ اہلِ نظر کے نزدیک اور بڑھتا اور اُجاگر ہوتا ہے۔

مغرب میں تو یک طرفہ مدح سرائی، یا تنقید کو گھٹیا پن تصوّر کیا جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جب بھی کوئی شخص کسی نظریہ شخص یا کردار پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہے تو ایمانداری سے اس کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ حتی الامکان جانب داری سے اس کا دامن آلودہ نہ ہو۔ پھر اگر تعریف و مدح کا کوئی رُخ ان کی نظروں میں جچ جاتا ہے۔ تو اس کی کھل کر تعریف کرتا ہے۔ اور جہاں جہاں، جن جن نکات سے اختلاف ہوتا ہے، اس کو بھی شائستگی مگر جرأت کے ساتھ بیان کر دینے میں کوئی جرم محسوس نہیں کرتا۔ لیکن ہمارے ہاں ابھی مذاق میں یہ سلجھاؤ اور توازن پیدا نہیں ہوا۔ یہاں بدنصیبی سے علم وادب کو لوگوں نے دائروں، مصلحتوں اور گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اس لئے اس وقت تک کوئی شخص اپنے کام کی صحیح داد نہیں پا سکتا جب تک کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی مخصوص گروہ یا حلقے سے نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پیمانہ یا معیار یہ نہیں ہے کہ آپ نے مذہب کی کیا خدمت کی، لٹریچر میں کیا اضافہ کیا، یا فکر و نظر کے قافلے کو آگے بڑھانے میں کس حد تک مدد دی، بلکہ یہاں سوال یہ ہے کہ آپ کسی جتھے سے وابستہ ہیں یا نہیں۔ اور آپ کی مساعی سے کسی گروہ یا جماعت کے تعصبات و مفادات کی حفاظت ہو پاتی ہے یا نہیں!

یہ افسوسناک تنگ نگہی جب تک ختم نہیں ہوتی اس وقت تک علم وادب صحیح معنوں میں ترقی نہیں کرسکتا۔ اور نہ اس وقت تک فکر و تصوّر کے گیسوئے تابدار میں مزید رونق و تابداری کے امکانات ہی اُبھر سکتے ہیں۔ ثقافت کا ایک نصب العین اس طرح کی تمام اجارہ داریوں کو ختم کرنا بھی ہے اور ایسے ماحول کو جنم دینا بھی ہے کہ جس میں تمام اہلِ علم محسوس کرنے لگیں کہ علم وادب سب کی مشترکہ میراث ہے اور جغرافیہ و حلقہ کی تبدیلی سے اس کی کیفیتوں میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔

اتنی سی بات تھی جو ہم "ثقافت" کے کسی پرچے میں لکھ چکے ہیں۔ اس کا ردعمل یہ ہوا ہے کہ اعظم گڑھ سے دریا باد تک غضب و عتاب کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اور مدیر معارف کا قلم تو بُری طرح بہک بہک گیا ہے ہمیں زود رنج خوش فہم اور خدا جانے کیا کیا قرار دیا گیا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علامہ عبدالسلام ندوی اور سید صاحب مرحوم کے بعد دارالمصنفین کی اخلاقی سطح اس حد تک گر سکتی ہے؟ بہرحال معارف کے شذرات نویس نے ہم پر جو ذاتی حملے کئے ہیں اس کا کوئی جواب نہیں دینگے۔ ہاں قارئینِ ثقافت مطمئن رہیں کہ جونہی اجتہاد سے متعلق مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب کی تصنیف داستان امیر حمزہ مکمّل ہوتی ہے، ہم اس کا مفصّل جواب لکھیں گے۔ اور یہ مژدۂ جانفزا سن رکھئے کہ وہ بہت دلچسپ ہوگا۔ حافظ صاحب کا مضمون ایسے ایسے عجائب، تناقضات اور علمی و فنی طرفہ طرازیوں پر مشتمل ہے کہ اس کے لطف میں ثقافت کے پڑھنے والوں کو شریک نہ کرنا ہم کسی طرح بھی جائز نہیں سمجھتے۔

مدیر "صدق" نے بھی ہماری گذارشات پر ناک بھوں چڑھائی ہے۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ ان کا جواب دینے سے بوجوہ ہم قاصر ہیں۔ ایک تو وہ کبھی بھی ہماری نظروں میں جچے نہیں۔ کیونکہ جب وہ بقول خود کافر تھے (دروغ برگردنِ راوی) تب بھی ان کا مطالعہ جذبات سے آگے نہیں بڑھ پایا تھا۔ اور اب جبکہ دوبارہ مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں، اور احسان و سلوک کی منزلیں طے کی ہیں، تب بھی جذبات کی سرحدوں سے آگے نہیں نکل پائے۔ اسلامی عقائد و افکار اپنی تہہ میں کس قدر واضح بنیادیں رکھتے ہیں، ان کی محکمی و استواری کے لئے موجودہ علوم و فنون نے کس درجہ ثبوت مہیا کئے ہیں اور اس کے کٹر حریف سائنس نے اس کے سامنے کیسے کیسے محیر العقول انداز سے سپر ڈالی ہے؟ یہ سب حقائق ایسے ہیں کہ ہر پڑھا لکھا آدمی انسے واقف ہے۔ مگر یہ ہیں کہ ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ کا وجود بھی جو کائنات کی سب سے روشن حقیقت ہے، زلزلوں، تباہیوں اور انسانی فکر و تدبیر کی واماندگیوں پر موقوف ہے۔ اس کے لئے ان کے پاس کوئی سنجیدہ اور مثبت دلیل نہیں، جسے یہ پیش کرسکیں۔ اس کے برعکس الٰہیات و عقائد ایسے بلند مسائل کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے ان کی عام تکنیک یہ ہے کہ اگر کہیں بہت بڑا سرمایہ دار مرگیا، کوئی عظیم سائنٹسٹ کسی حادثہ کا شکار ہوگیا، کوئی جغادری جہاز ڈوب گیا، یا کہیں کوہ پیکر ہتھنی غش کھا کر گر پڑی، تو انہوں نے شور مچانا شروع کردیا کہ دیکھئے ان واقعات سے کس کس نہج سے اللہ تعالےٰ کا ثبوت ہوتا

ہے، اور کس کس پہلو سے مخلوق کے عجز پر روشنی پڑتی ہے۔ گویا زندگی اور فکر کی نشاط آفرینیوں اور شادمانیوں میں قدرتِ خداوندی کا کوئی جلوہ کارفرما نہیں ہے اور ہم مجبور ہیں کہ جب تک کوئی سانحہ نوعِ انسانی پر نہ گزر جائے اس کو تسلیم نہ کریں۔

ان سے نمٹنے میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ کبھی بھی ان کے سامنے کوئی متعین اصول نہیں رہا ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ دوستی اور مخالفت کو کچھ اشخاص سے وابستہ سمجھ رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ناخوش ہوں تو جماعت اسلامی کے نسبتہً متوازن عقائد میں بھی ان کو خلل نظر آنے لگتا ہے۔ اور خوش ہوں تو غالی قادیانی بھی ان کا ممدوح قرار پا سکتا ہے۔ ان حالات میں ان سے کوئی اُلجھے تو کیسے؟ اور بحث کرے تو کیونکر؟

اصل میں ماجد صاحب ایک اچھے اور کامیاب طنز نگار ہیں، یہ مذہب کے بجائے اگر ادب کو اپنی جولانگاہ ٹھہراتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔

مدیرِ معارف نے دو الزام ہم پر ایسے عائد کئے ہیں جن کا جواب نہ دینا اعترافِ جرم کے مترادف ہوگا۔ ایک یہ کہ ہم غزالی و رومی کے ادعائے ترجمانی کے باوجود تصوف کے مخالف ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم نے وقتاً فوقتاً علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم پر چوٹیں کی ہیں۔ یہ دونو باتیں غلط ہیں۔ تصوف کا چاہنے والا ہم سب سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے؟ یہی تو قلب و ذہن کا وہ لطیفہ ہے جس سے فکر میں گہرائی، کردار میں نکھار اور مذہب میں رواداری و روشن ضمیری کے داعیے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سے ظواہر اور باطن میں جو نازک فرق ہے اس کی سرحدیں ممیز ہوتی ہیں۔ اسی سے اصولِ دین اور فروع کی کڑیاں الگ الگ نظر آتی ہیں۔ اور اسی کی بدولت اس حقیقت کا انکشاف ہو پاتا ہے کہ روح و فکر کی وہ جامع قدریں کون ہیں، جن کو جانِ مذہب اور عطرِ دین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ـــ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی اس کی خدماتِ جلیلہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے اسلام کی برکات کفرستانِ ہند میں پھیلی ہیں۔ اس سے ہمارے عہدِ زوال و انحطاط میں بھی کردار و سیرت کے اعلیٰ نمونے عمل کے تاریک افق پر چمکے ہیں اور انسان خواہشات کی پستیوں سے نکل کر اوجِ اخلاص پر متمکن ہوا ہے۔ یہی وہ خیال ہے جس نے ہمارے ادب کو زندگی جاوید بخشی ہے۔ وسعت و نزاکتِ معنی کی دولت سے بہرہ مند کیا ہے اور یہی وہ مے نشاط آگیں ہے جس نے عقیدہ و فکر کے پورے میکدہ میں کیفیت و اہتزاز کی بجلیاں دوڑا دی ہیں۔

بنا بریں کون کور ذوق ایسا ہے جو اس کی مخالفت کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ ہمیں ان لوگوں کی سطحیت سے شدید اختلاف ہے جو از راہِ سہل انگاری اسے سازشِ عجم کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ اس سازش نے معنی و عمل کے کتنے شاندار نتائج پیدا کئے ہیں۔ اگر یہ تصوف ہے اور یہی تصوف ہے جو مذہب کی حقیقی قدروں سے تعرض کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ پوری کائنات سے محبت و یگانگت کے رشتوں کو کیونکر اور کن بنیادوں پر استوار کیا جا سکتا ہے۔ تو اس کے لائقِ تعریف ہونے میں کیا شبہ ہے؟ لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس سے مراد الفاظ پرستی ہے، جمود ہے، تعصبات ہیں،

حلقہ و دائرہ کی رعائتیں ہیں۔ تو ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم اس کے مخالف ہیں۔ اسی طرح ہم سید صاحب مرحوم کی جلالتِ قدر اور ان کی علمی و تاریخی خدمات کے دل سے مداح ہیں۔ بلکہ ان کی روشن ضمیری اور اعتدال و توازن تو ہمارے لئے سرمایہ صد نازش ہے جو ان کی تمام تصنیفات میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں، ان کی توہین کو ہم اس پورے مدرسہ فکر کی توہین سمجھتے ہیں جس کے لئے ندویت سے بہتر اور کوئی لفظ چنا نہیں جا سکتا۔ مگر اس کا کیا کیجئے کہ آخر آخر میں خود انہیں اپنے مقام کی بلندیوں کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ سیرت النبی، حیات مالک اور سیرت عائشہ کا مصنف بہشتی زیور کے مصنف کے حلقہ بگوشوں میں نام لکھوانے کو اپنے لئے سعادت اُخروی تصوّر فرمائے ہمیں بتایا جائے کہ سید صاحب مرحوم کے اس اقدام کو اپنے مقام کو نہ پہچاننے کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ کیا سید صاحب قبلہ کی علمی و دینی خدمات ایسی نہ تھیں کہ ان کے لئے ازدیادِ درجات کا باعث ہو سکتیں؟ اور عند اللہ ان کے تقرب و اتصال کا موجب بن سکتیں۔ کیا دار المصنّفین کی علمی کاوشیں خانقاہ کے تمام کارخانہ حرکت و خروش پر بھاری نہیں۔ اور ایک مصنف کی کاوشہائے فکری و ادبی بجائے خود ایک بہت بڑی نیکی نہیں اور تسبیح و دانہ کی گردش و شغل سے ہزار درجہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

ہم سید صاحب کے اس پہلو پر جب تنقید کرتے ہیں تو اس سے مقصود ان کی ذاتِ گرامی کو زیرِ بحث لانا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنی اس حیثیت سے بھی بہت پیارے اور محبوب شخصیت کے مالک تھے۔ بلکہ اس رجحان کی مضرتوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ندویت کا وہ تصوّر غارت ہوا، جس کے لئے علامہ شبلی مرحوم نے عمر بھر جد و جہد کی۔ بلکہ جس کو پروان چڑھانے کے لئے خود سید صاحب اور ان کے رفقاء کار نے گرانبہا خدمات انجام دیں۔

سید صاحب کی زندگی کا یہ پہلو اس اعتبار سے ہمارے لئے نہایت تکلیف دہ ہے کہ عین اس وقت انہوں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنی توجہات کا رُخ دوسری طرف پھیر لیا جب کہ اس تصوّر کو آگے بڑھانے کا وقت آیا تھا۔ لوگ اس کی ضرورت و اہمیّت کے حقیقۃً قائل ہوئے تھے اور ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ ندوی برادری مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی دوسری شاخوں کی ترویج و تعلیم پر خصوصیت سے زور دیتی اور نسبتۃً زیادہ جامع اور زیادہ روشن ضمیر علماء پیدا کرنے کا کوئی جتن کرتی۔

مدیر معارف نے ہماری معروضات کو قطعی غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ ہم نہ تصوف کے مخالف ہیں اور نہ سید صاحب مرحوم کے خلاف کوئی جذبہ عناد رکھتے ہیں۔ ہمیں ان سے ہمدردی ہے۔ ہم دار المصنّفین کی وقیع خدمات کے بھی معترف ہیں۔ اور بحالاتِ موجودہ اس سے زیادہ اور کسی چیز کے طالب نہیں کہ یہ تجدد و تکفیر کے ماجرانہ حربوں سے اپنے کو محفوظ رکھیں اور کسی ادارہ یا شخص کے بارہ میں اظہارِ خیال کرتے وقت تقاضائے احتیاط سے روگرداں نہ ہوں۔